ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

وجودیت

(Existentialism)

عصمت اللہ، اسسٹنٹ پروفیسر
پی ایچ۔ڈی اردو سکالر، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
فریحہ تبسم، لیکچرار
پی ایچ۔ڈی اردو سکالر، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
ڈاکٹر رابعہ سرفراز
صدر شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract:
Existentialism is a dominant philosophic movement of 20th century which influenced western literature extensively. It explored existence of individual as free human being determining his own fate. Existentialism portrayed alienation, absurdity and meaninglessness of modern man in modern era. After the two world wars, salivary, colonialism, detoriation of civilization and values, mankind was suffering with the dilemma of identity. Constraints and coercion of social and religious norms menaced main's freedom. Soren Kierkegaard was the father of this philosophy. Sartre, Albert, Camus, Friedrich Nietzsche, Franz Kafka and Fyodor Dostoevsky advocated this philosophy in their writings. Action, freedom and decision are the three core beliefs of this movement. Colin Wilson ended this movement by blending it with romanticism. Urdu literature was also influenced by his movement.

Keywords: Existentialism. Absurdity, Alienation, Coercion.

وجودیت لفظ وجود سے ماخوذ ہے اور عربی الاصل ہے۔ فارسی میں ہست اور لاطینی زبان میں Existention کہلاتا ہے۔ لفظ وجود کے لغوی معنی ہستی، ذات، مقصد کا حصول، جسم، سانس، پیدائش اور زندگی کے ہیں جب کہ اس کے اصطلاحی معنی نفسیات اور جدید فلسفہ کی تحریک کے ہیں جو زندگی کی حقیقت کو فرد کے موضوعی تجربے سے پرکھے۔ وجود جوہر سے زیادہ اہم ہے۔ جوہر کے معنی قائم بالذات کے ہیں جو محتاج محل نہ ہو۔

وجودیت دراصل بیسویں صدی کا فلسفیانہ نظریہ ہے۔ جس کا مرکزی تصور "فرد" اور اس کا وجود ہے۔ بنیادی طور پر وجودی دبستان کا ادب سے براہِ راست تعلق نہیں تاہم بین الاقوامی ادبی تخلیقات نے اس فلسفہ سے گہرا اثر لیا اور چند دہائیوں تک ادبی حلقوں میں موضوعِ بحث اور وجہ تصنیف بنا رہا۔ انیسویں صدی کے تقریباً نصف میں شلنگ اور ہیگل کے نظریات کے مباحث میں نئے تنقیدی شعور بیدار ہو رہے تھے۔ انیسویں صدی اضطراب و تغیرات کی صدی تھی۔ جبر، غلامی، نوآبادیات اور آمریت کے خلاف شعوری بیداری کا آغاز ہو رہا تھا۔ مفلوک الحالی، معاشی پستی اور سماجی ابتذال اور سیاسی انتشار نے تہذیبی و مذہبی اقدار کو ریزہ ریزہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مذہب و فلسفہ ناکام ہو رہے تھے۔ کلیسا و مندر اور شاہی ایوانوں کے بام و در اپنے راز اُگل رہے تھے۔ پھر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں نے انسانیت کا بچا کچھا بھرم بھی توڑ دیا تھا۔ مفادات اور تسلط کی اس جنگ میں انسان کی نسل کشی ہو رہی تھی۔ زندگی پر مجہولیت اور مہملیت کی دبیز تہہ چڑھ رہی تھی۔ انسانوں کی اس بھیڑ میں فرد مر رہا تھا۔ اس کی شناخت قنوطیت و انتشار کے اس ہجوم میں کہیں کھو گئی تھی۔ اس صورتِ حال سے قبل بھی یونانی فلاسفہ کے ہاں "میں ہوں" کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ تاہم کیرکے گارڈ اس فلسفہ کا پہلا موید تھا جس نے جوہر کے مقابل وجود کو اہمیت دی۔ انسان کو اپنی ذات کا تعین کا حل پیدا کرنے کا درس دیا۔ اجتماع میں فرد کی کھوج لگانے کو کہا "انسان وہی کچھ ہے جو وہ خود کو بناتا ہے" اس کا بنیادی فلسفہ تھا۔ کیرکے گارڈ کی خوش بختی یہ رہی کہ اُسے اس کاروان میں جبریل مارس، رچرڈ کورنر کا ساتھ ملا۔ علاوہ ازیں سارترے اور مارٹن ہیڈیگر نے عروج

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

تک پہنچایا۔ یاد رہے کہ سارترے اور ہیڈیگر اس فلسفے میں خدا کے بھی منکر رہے اور انسان کو اپنے وجود کو ثابت کرنے اور ظلم و بربریت کی لتھڑی انسانیت کو جبر سے نکلنے کے لیے امید دکھائی۔

سارترے کا فلسفہ وجودیت ان لفظوں میں عیاں ہے:

''انسان ایک طرح کے خالی پن یا کیچڑ میں پھنسا پیدا ہوتا ہے۔ اسے اختیار حاصل ہے کہ اسی کیچڑ میں پڑا رہے اور ایسی نیم بیدار حالت میں جس میں خود اسے اپنے ہونے کا احساس نہ ہو، انفعالی، مجہول اور بالکل پچھڑی ہوئی زندگی گزار دے۔''(۱)

''تقدیر سے تدبیر بہتر'' کا نعرہ فرد کو نظریات، مجرد تصورات اور مذہبی جکڑ بندیوں سے نجات دلانے کا دعویٰ تھا۔ وہ فرد جو مجہول انداز میں زندگی گزارنے پر آمادہ رہے اور تدبیر سے کام نہ لے بلکہ تقدیر کے جبر کو مقدر بنالے تو وہ نہ صرف قابل مذمت ہے بلکہ قابل حقارت ہے۔ اس کی انسانیت کا شرف سر جھکانے میں نہیں بلکہ اس مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی کرب سے نکلنے کے لیے حرکیت میں پوشیدہ ہے۔ اس لغویت بھری کائنات کا معنی فرد کی ذات دے سکتی ہے۔ یاسیت و پس مردگی سے نجات کا واحد راستہ خود کو باعمل بنانے میں ہے۔ جبر و اختیار میں اُسے اپنی خود مختاری کا انتخاب کرنا ہے۔ اس بے چہرگی، نااُمیدی، تنہائی اور بے گانگی کے کرب سے نکلنے کے لیے اُسے کسی روحانی و تجریدی سہارے کی ضرورت نہیں۔ فطرت نے اُسے اس مہمل و لغو دنیا کو تبدیل کرنے کے قابل بنایا ہے۔ وہ اپنی تقدیر کا خود کاتب ہے۔ اپنے درد کی مسیحائی وہ خود کر سکتا ہے۔ یہ اس کا اختیار ہے کہ اس کرب سے دوچار رہے یا نجات پالے۔

سارترے، دوستوفسکی، کافکا اور کامیو نے اپنی تصنیفات میں اس فلسفے کو سمویا۔ سارترے اور وجودیت باہم لازم و ملزوم دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی تمام تحریریں کیفے میں لکھنے والے سارتر کو سیمون دی بوار کا ساتھ ملا۔ دونوں نے وجودی نقطہ نظر کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ سیمون دی بوار نے تانیثی نقطہ نگاہ سے ادب کو دیکھا۔ سارتر کا ناول ''سزائے موت میں التوا'' متلی ڈرامہ "Intinacy" میں وجودیت کا فلسفہ نمایاں ہے۔ ان تمام تصانیف کے مرکزی کردار بے معنویت میں معنی تلاش کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔ روایتی اور قدیم سوچ سے چھٹکارا ہی کامل آزادی کا ضامن ہے۔ انسان اپنی زندگی کا خالق خود ہے وہ اپنے ہر قدم اور فعل کا ذمہ دار ہے۔ اس کی تنہائی، بے گانگی، یاسیت اور بے چہرگی اس کی اپنی بے عملی اور ذہنی غلامی کی بدولت ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے سارتر کے فلسفے کو یوں بیان کیا ہے:

''بیسویں صدی کی دو عالم گیر جنگوں نے یورپ کے مادہ پرست انسان کو بری طرح سے جھنجھوڑ دیا تھا اور عالمی جمہوریت کا خواب ایک عالمگیر آمریت کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔۔۔ اس نے ظلم کے خلاف مزاحمت کے لیے The Flies، No Exit اور Being and Nothingness میں وجودی فلسفے کا فکری زاویہ پیش کیا۔۔۔ چنانچہ سارتر کی نظر میں ادب زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ یہ انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا وسیلہ ہے۔''(۲)

البرٹ کامیو کا ناول ''اجنبی'' بھی لامعنویت سے پیدا ہونے والی بے گانگی اور بے شناختگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ''مارسالٹ'' سماج کے مصنوعی ڈھانچے میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ کامیو کے ناول The Plague اور The Fall میں بھی ایسے ہی کردار تخلیق کیے گئے ہیں۔

فرانز کافکا جسے لایعنی کیفیتوں کا فکشن نگار کہا جاتا ہے۔ فرد کے داخلی تصادم اور نفسیاتی کشمکش کی مؤثر تصویر کافکا کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ اس کے ناول The Trial (مقدمہ)، The Cartle (فلسفہ) اور افسانوں میں اس معاشرتی انتشار کی گونج سنائی دیتی ہے جو ۱۹۱۶ء کے لگ بھگ یورپ کے افق پر سنائی دے رہی تھی۔

فریڈرک نطشے اپنے قول ''میرا وجود ہے اس لیے میں سوچتا ہوں'' سے وجودی فکر کا حامل وجودیت کا نمایاں سرخیل ہے۔ ''سپرمین'' کے تصور سے نطشے نے انسان کو یقین کامل کا درس دیا۔ اپنے وجود کا ایقان اور تصورِ حرکت نے انسان کو اس کی یاسیت و اجنبیت سے نکلنے کا راستہ دکھایا۔ ''زرتشت نے کہا'' نطشے کی فکر کی عکاس ہے۔ نطشے نے ''خدا مر گیا ہے'' کا اعلان کر کے متنازعہ بحث کا آغاز کیا۔ اس کا فوق البشر دراصل انسان کے وجود کا اعلان تھا۔ فرسودگی کے خلاف اعلانِ بغاوت کر کے نطشے نے انسان کو اس کے ہونے اور اپنی شناخت کو منوانے کے لیے ''فوق البشر'' کا تصور دیا۔ Anti Christ میں اس نے عیسائیت کی کہنہ تعلیمات کو بری طرح سے رگیدا۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

فیودر دوستوفیسکی مقبول روسی ناول نگار ہیں۔ جن کی تحریریں وجودیت کے فلسفہ کی غماضی کرتی ہیں۔ ان کے ناول ''جرم و سزا''، ''ایڈیٹ''، ''برادرز کارمازوف''، ''جواری'' اور ''ذلتوں کے مارے لوگ'' میں مرکزی کردار اپنے وجود کی شناخت اور نفسیاتی کرب سے گزرتے ہیں۔ ''جرم وسزا'' میں کم سن کرایہ دار کا مالکن کو قتل کر کے جرم چھپانے میں کشمکش کو دکھایا گیا ہے جبکہ ''ایڈیٹ'' روس کے سیاسی و سماجی انتشار کی کہانی ہے جس میں افراد کی اخلاقی و سماجی کرب سے گزرنے کی داستان ہے۔ جبکہ ناول ''برادرز کارمازوف'' تین بھائیوں کے کردار کے ذریعے انسانوں کی خود غرضی، بے حسی اور بے گانگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

وجودیت کی اس فلسفیانہ تحریک کو کولن ولسن نے "Out Sider" تصنیف کر کے نئی سمت عطا کر دی۔ کولن ولسن نے وجودی مفکرین کے کثرت تعبیر سے فلسفہ وجودیت کی پیچیدگی کو کم کیا اور وجودیت ور رومانویت میں امتزاج پیدا کر کے ''نوجودیت'' تخلیق کی۔

نظام صدیقی کہتے ہیں:

''بیسویں صدی کی ستر کی دہائی شدید سماجی، تہذیبی، سیاسی اور فکری اضطراب کا دورانیہ تھی۔ ایک نئی پیدائش کا پیش سایہ دراز ہو رہا تھا۔ ایک فیصلہ کن آخری انحراف جدیدیت سے رونما ہو رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے جدیدیت خود وکٹوریائی امتناعات، خاندانی زندگی اور کوگیتو (میں سوچتا ہوں اس لیے ہوں) کے ریزہ کار تصور سے منحرف ہوئی تھی۔۔۔ ''موجودگی کی مابعد الطبیعات'' کی رد تشکیل کے بعد، ایک نئے وجود کی پیش منظر پر دھکیل دیا گیا۔۔۔ ایک بیگانہ انسانی وجود کے اس تصور پر بیسویں صدی کے وجودی فلسفہ کی پرورش ہوئی۔''(۳)

مغرب میں وجودیت کا فلسفہ دوسری جنگ عظیم تک کے زمانے پر محیط ہے۔

مشرق بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں جدیدیت کے رجحان نے فلسفہ وجودیت کو جگہ دی۔ موضوعاتی اعتبار سے جدیدیت کی بنیادیں وجودی فکر پر استوار تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد تقریباً چار دہائیوں تک وجودیت فکر کے تحت اُردو ادب نے علامتی و تجریدی اسالیب میں اظہار پایا۔ موضوعاتی و تکنیکی اعتبار سے ادب کی اصناف میں تبدیلی آئی۔ جدیدیت وجودیت کے فکری و ذہنی وابستگی نے انہیں باہم مربوط کر دیا۔ تقسیم اور ہجرت کے المیہ نے برصغیر پاک و ہند کے ساکنان کو جس اخلاقی و نفسیاتی کرب سے دوچار رکھا، اس کا اظہار بھرپور طریقے سے ہوا۔ لایعنیت، بے معنویت، مملیت، میکانیت اور تہذیبی بحران نے اخلاقی پستی کو جنم دیا۔ اس یاسیت زدگی میں وجود کی تلاش کا سفر شروع ہوا تو اُردو ناول و افسانہ اور شاعری نے ''فلسفہ وجود'' کو اپنے اندر سمویا۔

اُردو ناول میں وجودی فکر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جدید اُردو ناول نے علامت و تجرید کے اسالیب میں انسان کی تنہائی و بے گانگی کو بے نقاب کیا۔ جوگندر پال کا ناول ''ناہید''، صدیق سالک کا ''پریشر ککر''، ''ایمرجنسی''، انیس ناگی کا ''دیوار کے پیچھے'' اور ''محاصرہ''، فہمیدہ عظمی کا ''جنم کنڈلی'' اور بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' وجودی فکر کے اثرات کے حامل ہیں۔

اُردو افسانے نے بھی اجتماع میں فرد کی تلاش کی۔ وجودیت کے تحت سریندر پرکاش، بلراج مینرا، انور سجاد، رشید امجد اور انتظار حسین نے افسانے لکھے۔ علامتی و تجریدی اور اساطیری اسلوب لیے یہ فن پارے انسان کے داخلی کرب کے عکاس ہیں۔

اُردو نظم میں مجید امجد، وزیر آغا، افتخار جالب، سلیم الرحمان، جیلانی کامران، ن۔ م راشد اور میراجی کے ہاں فرد کی جذباتی مغائرت اور تنہائی کی عکاس ہے۔ اُردو نظم میں منیر نیازی تنہائی و بے گانگی کے شاعر ہیں۔ الغرض وجودیت نے فرد کو اپنا موضوع بنایا۔ مطلق آزادی اور سماجی و مذہبی جبر، تہذیبی و معاشرتی ابتذال میں بے معنویت کو کھوج کر قوت عمل عطا کی۔

حوالہ جات

1۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، منتخب ادبی اصطلاحات، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۷۹

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

2۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۹۲
3۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، مرتبہ، بیسویں صدی میں اُردو ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۳۷